

سندس ہاشمی

لیکچرار، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج برائے خواتین کھوٹہ

جرمن تحریکِ مشرق کی بازیافت: پیامِ مشرق کے دیباچے

کے تناظر میں

Revisiting the German Oriental Movement: A Study in  
the Context of the Preface to Payam-e-Mashriq

**ABSTRACT:**

In the early nineteenth century, an intellectual and literary movement emerged in Germany that came to be known as the “Oriental Movement.” This movement was marked by a growing interest among German writers and thinkers in Eastern literature, particularly Persian poetry. In the preface to his Persian poetic collection Payam-e-Mashriq (1923), Allama Muhammad Iqbal referred to this trend and recognized it as a literary movement. This article examines the historical background, underlying causes, and major representatives of the movement in Germany. It further argues that, with this movement in view, Iqbal outlined a significant research framework in the preface to Payam-e-Mashriq, highlighting new avenues for the study of Eastern–Western literary and intellectual interactions. This research contributes to comparative literature, intellectual history, and postcolonial studies by underscoring Iqbal’s enduring relevance in cross-cultural exchanges.

**KEYWORDS:** Allama Iqbal, Piyam -e - Mashriq  
Goethe, Oriental Movement, Rukert, Platen, Bodenstat.

علامہ محمد اقبال برصغیر کے ان ممتاز شعراء اور مفکرین میں شمار ہوتے ہیں جن کی شاعری محض جمالیاتی اظہار نہیں بلکہ ایک فکری، فلسفیانہ اور تہذیبی منصوبہ ہے۔ اقبال نے مغربی فلسفہ اور ادب کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کے ساتھ وہاں کے فکری نظام کو تنقیدی نظر سے دیکھا ہے۔ ان کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے مغربی فکر سے استفادہ کرتے ہوئے مشرقی روحانیت، اسلامی تصورات اور قومی شعور کو نئی فکری جہتیں عطا کیں۔ اقبال کی اُردو اور فارسی

شاعری میں نظم کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس صنف کے ذریعے وہ فرد اور قوم کے فکری و اخلاقی مسائل پر براہ راست گفتگو کرتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں روایت سے انحراف اور جدید فکری اسلوب کا شعوری استعمال نظر آتا ہے جو انہیں محض شاعر نہیں بلکہ ایک عہد ساز مفکر کی حیثیت عطا کرتا ہے۔

پیام مشرق علامہ اقبال کا تیسرا فارسی مجموعہ ہے جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کے دیباچے میں اقبال واضح طور پر بیان کرتے ہیں کہ یہ تصنیف گوئے کے مشہور شعری مجموعے مغربی مشرقی دیوان کے جواب میں لکھی گئی ہے جو ۱۸۱۹ء میں منظر عام پر آیا۔ یوں دونوں تصانیف کے درمیان تقریباً ایک صدی کا زمانی فاصلہ موجود ہے۔ علامہ اقبال دیباچے میں جرمنی میں انیسویں صدی کے اوائل میں مشرقی ادب کی جانب پیدا ہونے والے اس رجحان کی نشاندہی کرتے ہیں جسے بعد ازاں مشرقی تحریک کے عنوان سے تعبیر کیا گیا۔ ان کے بیان کے مطابق اس رجحان کا آغاز ایک فکری اور ادبی میلان کی صورت میں ہوا جس کے نتیجے میں مشرقی ادب کے تراجم، مطالعات اور تنقیدی مباحث کا سلسلہ شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ میلان مطالعاتی سطح سے بلند ہو کر جرمن ادیبوں اور شاعروں کے تخلیقی اظہار میں بھی نمایاں طور پر ظاہر ہونے لگا۔ پیام مشرق کے دیباچے کے اختتام پر علامہ اقبال اس امید اور خواہش کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مشرقی تحریک کی پوری تاریخ لکھنے اور جرمن اور ایرانی شعراء کا تفصیلی مقابلہ کر کے عجیب  
اثرات کی صحیح وسعت معلوم کرنے کے لیے ایک طویل مطالعہ کی ضرورت ہے جس کے  
لیے نہ وقت میسر ہے نہ سامان۔ ممکن ہے کہ یہ مختصر سا خاکہ کسی نوجوان کے دل میں  
تحقیق و تدقیق کا جوش پیدا کر دے۔ (۱)

اس ضمن میں چند اہم تحقیقی سوالات توجہ کے متقاضی ہیں۔ اول یہ کہ وہ کون سے تاریخی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی عوامل تھے جنہوں نے جرمن اہل قلم کو مغربی فکری روایت سے کسی حد تک بیزاری یا عدم اطمینان کی کیفیت میں مبتلا کر کے مشرقی روحانیت، فلسفے اور ادب کی طرف مائل کیا۔ دوم یہ کہ آیا اس رجحان کو محض ایک ادبی میلان اور فکری رجحان سمجھا گیا یا اسے باقاعدہ ایک منظم ادبی تحریک کی حیثیت دی گئی۔ انھی سوالات کی روشنی میں یہ مقالہ اپنی بنیادی تحقیقی جہت کا تعین کرتا ہے اور جرمن ادب میں مشرقی اثرات کے تاریخی و تنقیدی مطالعے کو اپنا مرکزی موضوع بناتا ہے۔

جرمنی میں مشرقی ادبی تحریک کے باقاعدہ آغاز کو ۱۸۱۲ء میں Joseph von Hammer-Purgstall کے حافظ کے دیوان کے جرمن ترجمے سے منسلک کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ جرمن ادبی دنیا میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس نے فارسی شاعری بالخصوص حافظ کے کلام کو ایک منظم اور سنجیدہ ادبی متن کے طور پر متعارف کروایا۔ اس ترجمے نے Johann Wolfgang von Goethe کی فکری اور تخلیقی شخصیت پر گہرا اثر ڈالا جس کے نتیجے میں ان کا رجحان مشرقی ادب کی طرف بڑھا۔ جس کے حوالے سے آر تھرریکی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

The direct impulse to the composition of the Divan was the appearance, in 1812, of the first complete version of Persia's greatest lyric poet Hafiz, by the famous Viennese Orientalist von Hammer. (2)

گوٹے کی تصنیف West-östlicher Divan اس اثر پذیر ی کامنیاں ثبوت ہے جو مشرقی ادب سے ان کی گہری وابستگی اور فکری رغبت کو واضح کرتی ہے۔ گوٹے کا مشرقی ادب کی جانب مائل ہونے میں Johann Gottfried Herder کے اثرات بھی قابل ذکر ہیں جو خود مشرقی ادب خاص طور پر سعدی سے خاص شغف رکھتے تھے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ فان ہیمر کے ترجمے نے جرمنی میں مشرقی ادبی تحریک کو ایک باقاعدہ سمت عطا کی جس نے بعد میں گوٹے اور گوٹے کے بعد آنے والے جرمن ادیبوں اور شاعروں کے ہاں ایک تخلیقی اور فکری صورت اختیار کر لی۔

جرمنی میں مشرقی ادبی تحریک کے باقاعدہ آغاز اور اس کے گوٹے پر اثرات کے بعد یہ سوال نہایت اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ آخر وہ کون سے تاریخی، سیاسی، سماجی اور ادبی عوامل تھے جنہوں نے جرمن ادیبوں اور مفکرین کی توجہ مشرقی ادب کی طرف مبذول کروائی۔ یہ رجحان محض انیسویں صدی کی اچانک ادبی پیش رفت نہیں تھا بلکہ اس کے پس پشت ایک طویل تاریخی عمل کار فرما تھا جس کی جڑیں قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں ملتی ہیں۔ اسی تناظر میں ضروری ہے کہ ان ابتدائی روابط، تصورات اور ادبی اثرات کا جائزہ لیا جائے جنہوں نے جرمنی میں مشرقی ادب کے لیے فکری اور تہذیبی فضا کو بتدریج ہموار کیا۔

مذہبی سطح پر اس رجحان کی ابتدائی بنیاد مارٹن لوتھر کی قائم کردہ پروٹسٹنٹ روایت میں ملتی ہے جس نے بائبل کو اس کی اصل زبانوں (عبرانی اور یونانی) میں سمجھنے اور پڑھنے پر زور دیا۔ اس فکری رجحان نے جرمن علمی

حلقوں میں لسانی و متنی تحقیق کے ذوق کو فروغ دیا اور پہلی مرتبہ مشرقی زبانوں اور تہذیبوں کی جانب سنجیدہ توجہ مبذول کروائی۔ یہی philological tradition بعد میں عربی، فارسی اور سنسکرت کے مطالعے کی بنیاد بنی۔

سیاسی اعتبار سے بھی جرمنی کے حالات نے اس فکری رجحان کو مہمیز دی۔ تیس سالہ جنگ (۱۶۱۸ء-۱۶۴۸ء) کے بعد جرمن خطہ سیاسی انتشار، معاشی تباہی اور متعدد چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ دوسری طرف عثمانی ترکوں کی پیش قدمی اور محاصرہ ویانا نے یورپی ذہن میں مشرق کو ایک اہم سیاسی و تہذیبی حقیقت کے طور پر نمایاں کیا۔ اس سیاسی پس منظر میں جرمن دانشوروں نے اپنی قومی اور تہذیبی شناخت کے سوال پر غور شروع کیا اور بعض مفکرین نے اس شناخت کی تشکیل کے لیے مشرقی تہذیبوں خصوصاً ہندوستان اور ایران کی طرف رجوع کیا۔

تہذیبی اور ادبی سطح پر بھی اس رجحان کی اپنی اہمیت تھی۔ اگرچہ اس دور میں جرمنی کی علمی روایت پر یونانی ادب، فلسفے اور کلاسیکی جمالیات کا گہرا غلبہ تھا مگر رومانوی تحریک کے بعض اہم مفکرین جیسے Friedrich Schlegel (جرمن رومانوی تحریک کے بانی، سنسکرت کے عالم) نے اس کلاسیکی مرکزیت سے بیزاری محسوس کی اور مشرق کو ایک نئے فکری و جمالیاتی افق کے طور پر دریافت کیا۔ شلیگل کے ہاں ہندوستانی اور ایرانی روایت نہ صرف لسانی و تاریخی دلچسپی کا مرکز بنی بلکہ اسے یورپی فکری روایت کے متبادل سرچشمے کے طور پر بھی دیکھا گیا۔

۱۸۱۲ء میں Joseph von Hammer-Purgstall کی جانب سے حافظ کے دیوان کے جرمن ترجمے کی اشاعت کو اگرچہ یورپ بالخصوص جرمن ادب میں مشرقی ادب کے باقاعدہ اور عمیق تعارف کا ایک اہم سنگ میل قرار دیا جاتا ہے مگر اس سے قبل بھی یورپی ادبی روایت میں مشرقی اثرات مختلف صورتوں میں موجود تھے۔ قرون وسطیٰ کے یورپ میں ہندوستان اور ایران کے متعلق معلومات نہایت محدود، بالواسطہ اور اکثر داستانوی نوعیت کی تھیں جو زیادہ تر یونانی، لاطینی اور کلیسائی مصادر سے اخذ کی گئی تھیں۔ ان معلومات میں حقیقت کے ساتھ افسانوی عناصر بھی شامل تھے جس کے باعث مشرق کو ایک پراسرار، جادوئی اور عجائبات سے بھرپور خطے کے طور پر تصور کیا جاتا تھا۔ جس کا اظہار آرتھر ریگی نے اپنی کتاب میں ان الفاظ میں کیا ہے:

India and Persia were magic names to conjure with their languages and literatures were a book with seven seals to medieval Europe. (3)

جرمن قرونِ وسطائی ادب میں یہ رجحان نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے جہاں ہندوستان اور فارس کو مہم جوئی، اسرار اور غیر معمولی واقعات کی سرزمین کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس ضمن میں Barlaam and Josaphat اور Herzog Ernst جیسی تخلیقات نہایت اہم ہیں جن میں مشرقی تہذیبی و داستانوی اثرات کی ابتدائی جھلک ملتی ہے۔

نشاۃ ثانیہ اور اس کے بعد یورپ کے مشرق سے تجارتی اور سفارتی روابط میں اضافے نے اس ادبی تعامل کو مزید تقویت دی۔ خصوصاً سترہویں صدی میں Adam Olearius کے سفر نامے اور ان کی فارسی ادب سے وابستگی نے جرمن دنیا میں مشرقی ادب کے تعارف کو ایک نئی جہت عطا کی۔ اولیبریس نے نہ صرف ایران کے سفر کے مشاہدات قلم بند کیے بلکہ ۱۶۵۴ء میں سعدی کی گلستان کا جرمن ترجمہ Persianischer Rosenthal کے عنوان سے پیش کیا جس نے فارسی نثر اور اخلاقی ادب کو یورپی علمی حلقوں میں متعارف کروانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اسی طرح Abraham Roger کی تصنیف De Open Deure نے ہندوستانی فکری روایت خصوصاً بھرتی ہری کے اقوال کو یورپ تک پہنچایا جس سے مشرقی حکمت اور اخلاقی فکر سے ابتدائی شناسائی ممکن ہوئی۔ اسی صدی کے جرمن ڈرامہ نگار اندریاس گریفیوس (Andreas Gryphius) نے فارسی تاریخ سے ماخوذ اپنے الیے Catharina von Georgien (۱۶۵۷ء) میں صفوی بادشاہ شاہ عباس اول کے عہد کی جارجیائی ملکہ کیتوان کے سانحے کو پیش کیا۔ اسی دور میں گریملز ہاوزن (Grimmelshausen) نے اپنے ناول Der keusche Joseph میں قرآن اور فارسی شاعری میں مذکور یوسف اور زلیخا کی داستان کو جرمن قارئین تک پہنچایا۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز میں فرانسیسی مستشرق انٹوان گیلان (Antoine Galland) کے ایک ہزار اور ایک راتیں (الف لیلہ) کے فرانسیسی ترجمے (۱۷۰۴ء-۱۷۱۷ء) نے پورے یورپ میں مشرقی کہانیوں کا رواج ڈال دیا اور اس کے فوراً بعد جرمن تراجم نے بھی یہ کہانیاں جرمنی میں مقبول کر دیں۔ اس کے نتیجے میں کرسٹوف مارٹن ویلانڈ (Wieland)، لڈوگ ٹیک (Tieck) اور ولہیلیم ہاف (Hauff) جیسے ادیبوں نے اپنی تخلیقات (مثلاً Abdallah Schach Lolo، اور The Caravan) میں مشرقی لباس، علامتوں اور

اسلوب کو اپنایا اور مشرقی مضامین پر کہانیاں لکھیں (۴)۔ اٹھارویں صدی میں فرانسیسی اور دیگر یورپی زبانوں کے واسطے سے الف لیلہ اور مشرقی قصصی ادب جرمنی تک پہنچا جس کے نتیجے میں جرمن ادیبوں اور شعراء میں مشرقی فضا، علامتوں اور اسلوب کی طرف ایک واضح میلان پیدا ہوا۔ روشن خیالی کا دور (سترھویں صدی کے اواخر سے آٹھارویں صدی) جرمنی میں مشرقی ادب کی طرف فکری رجحان کا ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ اس دور میں عقل، رواداری اور عالمگیر انسانی اقدار پر زور دیا جانے لگا۔ جرمن مفکرین بشمول لائبنیز اور بعد میں ہرڈ نے مشرقی تہذیب بالخصوص ایران اور ہندوستان کو محض عجائبات کی سرزمین کے طور پر نہیں دیکھا بلکہ انہیں اخلاقی حکمت، روحانیت اور عالمگیر اقدار کا ذخیرہ سمجھا۔ اسی فکری فضا نے جرمن ذہن کو مشرق کو ایک سمجھدار اور علمی انداز میں قبول کرنے کے لیے تیار کر دیا تھا۔ سوزین مارچنڈ اپنی کتاب میں لکھتی ہیں:

Indeed, the 'second Oriental renaissance' also provided the occasion for the rebirth of an Oriental movement with a difference.(5)

سوزین مارچنڈ اس تحریک کو "دوسری مشرقی نشاۃ ثانیہ" قرار دیتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اس نے ایک نئی قسم کی مشرقی تحریک کو جنم دیا۔ مارچنڈ کے مطابق یہ محض پہلی مشرقی نشاۃ ثانیہ (جس نے یونانی اور لاطینی کے ذریعے مشرق کو دیکھا تھا) کا تسلسل نہیں تھا بلکہ اس میں ایک فرق تھا۔ اب مشرق کو براہ راست اس کی اصل زبانوں (عربی، فارسی، سنسکرت) میں سمجھنے کی کوشش کی گئی اور اسے محض عجائبات یا مذہبی معلومات کا ذریعہ نہیں سمجھا گیا بلکہ ایک مکمل تہذیبی اور فلسفیانہ نظام کے طور پر دیکھا گیا۔ جرمنی میں یہ تحریک گونٹے، روکرٹ، پلائٹن اور بوڈن سٹاٹ جیسے شاعروں کے ہاں اپنے عروج پر پہنچی، اور اسی تحریک کا خاکہ علامہ اقبال نے پیام مشرق کے دیباچے میں پیش کیا۔

جرمن مستشرق پال ہورن نے اپنے مضمون "کیا ہم فارس کے مقروض ہیں؟" (۱۹۰۰ء) میں اس بات کی نشاندہی کی کہ فارسی اثرات نے جرمنی کی روزمرہ زبان کو بھی چھوا تھا۔ پال ہورن کا مضمون "Nord und Süd" (ایک جرمن ماہنامہ) کے جلد ۹۴، شمارہ ۲۸۲، ستمبر ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا تھا۔ علامہ اقبال نے اسی مضمون کو اپنے پیام مشرق کے دیباچے میں پیش نظر رکھا تھا۔ حالانکہ انہوں نے اس کا عنوان نہیں لکھا لیکن مندرجات کا اثر ان کے تحریر کردہ دیباچے میں ہے جہاں انہوں نے تحریک مشرق کا مختصر خاکہ پیش کیا۔ پال ہورن اپنے مضمون میں ایک خوبصورت منظر نامہ پیش کرتے ہیں:

Unter'm Jasmin saßen wir beim Schach wie im Paradiese, auf taffeter Decke standen die Tassen mit Karawanentheee aus dem Bazar Die sieben gesperrt gedruckten Worte dieses Satzes sind persisch, also auch in der Sprache des täglichen Lebens, der doch zum mindesten die Tasse angehört, sind wir Persien verpflichtet. (6)

ترجمہ: یاسمین (چنبیلی) کے نیچے ہم شطرنج کھیلتے ہوئے ایسے بیٹھے تھے جیسے جنت میں ہوں، ریشمی کپڑے (تافتہ) پر بازار سے لائی گئی قافلوں کی چائے کے پیالے رکھے ہوئے تھے۔ اس جملے کے سات نمایاں (الگ انداز میں لکھے گئے) الفاظ فارسی ہیں یعنی روزمرہ زندگی کی زبان میں بھی کم از کم پیالی/کپ تک ہم فارسی (ایران) کے مقروض ہیں۔

اس ایک جملے میں پال ہورن نے سات ایسے الفاظ نشانہ ہی کیے جو براہ راست فارسی ہیں۔ چنبیلی (Jasmin)، شطرنج (Schach)، جنت (Paradies)، تافتہ (taffet)، پیالہ (Tasse)، بازار (Basar)، چائے (Thee)۔ ہورن کے مطابق حقیقت میں روزمرہ جرمن زبان کا ایک بڑا حصہ فارسی قرضوں پر مبنی تھا اور جرمن عوام انہیں استعمال کرتے ہوئے بھی شاید اس بات سے بے خبر تھے کہ وہ مشرق سے لفظی طور پر مقروض ہیں۔ یہ اعداد و شمار اور نام نہیں بلکہ زبان کی اصل روح تھی۔ پال ہورن کے ان مشاہدات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مشرقی اثرات صرف علمی حلقوں یا اعلیٰ طبقے تک محدود نہیں رہے بلکہ روزمرہ کی زبان کے ذریعے عام جرمن گھروں تک پہنچ گئے تھے۔ سوزین مارچنڈ اپنی کتاب German Orientalism in the Age of Empire میں ہرمن ہوفنر کے ۱۹۰۷ء کے ایک مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے اس حقیقت کو مزید گہرائی سے پیش کرتی ہیں۔ ہورن ہوفنر لکھتے ہیں:

The longing for the Orient accompanies the Occidental from the cradle to the grave. When the young farmer's wife... tells him about the shepherds of Bethlehem... the rivers of the Nile and the Euphrates... Cyrus of Persia and the Pharaoh. (7)

اس طرح ہورن ہوفنر کا یہ اقتباس پال ہورن کی بات کی ہی تصدیق کرتا ہے کہ مشرقی اثرات جرمنی کی ہر سطح تک، زبان سے لے کر بچپن کی تعلیم تک پہنچ چکے تھے۔ یہی تمام مذہبی، سیاسی، تہذیبی اور ادبی عوامل مل کر ایک ایسا فکری ماحول تشکیل دیتے ہیں جس نے ۱۸۱۲ء میں فان ہیمر کے حافظ کے دیوان کے جرمن ترجمے کو

قبول کرنے کے لیے زمین ہموار کی۔ اسی فضا نے بعد ازاں گونے کو West-östlicher Divan جیسی عظیم تخلیق پر آمادہ کیا جو مشرق و مغرب کے ادبی مکالمے کا ایک لازوال نمونہ بن کر سامنے آئی۔

**تحریک مشرق کا آغاز:**

تیس سالہ جنگ (۱۶۱۸ء-۱۶۴۸ء) جرمنی کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی ڈھانچے کو تہہ و بالا کر دیا۔ یہ جنگ ابتداء میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے مذہبی اختلافات سے شروع ہوئی لیکن بتدریج یورپ کی بڑی طاقتوں کے مابین سیاسی بلا دستی کی کشمکش میں تبدیل ہو گئی۔ اس طویل اور تباہ کن جنگ کے نتیجے میں جرمنی کی آبادی میں نمایاں کمی واقع ہوئی۔ بے شمار شہر اور دیہات تباہ ہوئے اور ملک متعدد چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو کر اپنی مرکزی وحدت سے محروم ہو گیا۔ اس تباہی کے بعد جرمن معاشرے میں ایک سرد روحانیت کی فضا قائم ہو چکی تھی جہاں فکری انتشار، تہذیبی بحران اور داخلی خلل شدت سے محسوس کیا جانے لگا۔ اسی احساس محرومی اور روحانی خلا کو پُر کرنے کے لیے جرمن اہل فکر نے اپنی نظری اور تہذیبی جستجو کا رخ مشرق کی جانب کیا کیونکہ انہیں مشرق کی تہذیب، ادب اور فکر میں روحانیت، معنویت اور باطنی سکون کے نمایاں عناصر دکھائی دیے۔ یوں جرمنی میں مشرق کی طرف فکری میلان کی بنیاد ایک تاریخی ضرورت اور روحانی بازیافت کے تقاضے کے تحت استوار ہوئی۔

اسی تاریخی، سیاسی اور تہذیبی پس منظر میں جوزف فان ہیمر پرگستال (۱۷۷۳ء-۱۸۵۶ء) کی شخصیت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے جنہیں جرمن ادب میں مشرقی رجحان کی باقاعدہ بنیاد رکھنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے جن کے متعلق سوزین مارچنڈ اپنی کتاب میں لکھتی ہیں:

Hammer's translation of the Divan of Hafiz (1812-13) created a fad for Persian poetry, which lasted long into the nineteenth century and spurred the fabrication of two of the best-known works of European Orientalizing literature, Goethe's West-östliche Divan and Edward Fitzgerald's Rubaiyat of Omar Khayyam. (8)

ہیمر ایک آسٹریائی سفارت کار، مستشرق اور ماہر لسانیات تھے۔ انہوں نے Oriental Academy, Vienna میں ۱۷۸۸ء سے ۱۷۹۴ء تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۷۹۹ء میں ان کی تعیناتی استنبول میں آسٹریا کے سفارت خانے میں ہوئی جہاں انہیں عربی، فارسی اور ترکی مخطوطات کے وسیع ذخیرے تک رسائی

حاصل ہوئی۔ اسی قیام کے دوران انہوں نے متعدد فارسی اور ترکی مخطوطات جمع کیے جن میں حافظ کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ بھی شامل تھا۔ ۱۷۹۹ء میں ان کی تعیناتی استنبول میں آسٹریا کے سفارت خانے میں ہوئی۔ جب وہ پہلی بار ایشیائی سرزمین پر اترے تو سجدہ ریز ہوتے ہوئے اپنے روحانی وطن کی سرزمین ہونے کے ناطے اسے بوسہ دیا۔ جس کا اظہار آپ نے اپنی آپ بیتی میں یوں کیا:

Zum erstenmal betrat ich den Boden Asiens, beim  
Aussteigen aus dem Kajak warf ich mich zu Boden und  
küßte die Erde als die meines geistigen Vaterlandes. (9)

ترجمہ: جب میں نے پہلی بار ایشیا کی سرزمین پر قدم رکھا تو کشتی سے اترتے ہی میں زمین پر جھک گیا اور اسے اپنے روحانی وطن کی زمین سمجھ کر چوم لیا۔

استنبول جو کہ اس زمانے میں Ottoman Empire کا علمی اور تہذیبی مرکز تھا مشرقی مخطوطات کے ایک عظیم ذخیرے کا حامل تھا۔ یورپی سفارت کار اور مستشرقین یہاں سے نادر مخطوطات حاصل کر کے اپنے ممالک لے جاتے تھے۔ فان ہیمر نے اسی علمی ذخیرے سے حافظ کے دیوان کا نسخہ حاصل کیا اور ۱۸۱۲ء-۱۸۱۳ء میں اس کا پہلا مکمل مغربی ترجمہ Der Diwan von Mohammed Schemsed-din کے عنوان سے دو جلدوں میں شائع کیا۔ یہ ترجمہ Stuttgart اور Tübingen سے منظر عام پر آیا اور یورپی ادبی حلقوں میں غیر معمولی اہمیت اختیار کر گیا۔ فان ہیمر کی یہ علمی کاوش جرمن ادب کی تاریخ میں ایک اہم ادبی کارنامہ ثابت ہوئی کیونکہ اسی ترجمے نے Johann Wolfgang von Goethe کو اپنی معروف تصنیف Westöstlicher Divan لکھنے کی تحریک دی۔ یوں جرمن ادب میں مشرقی ادب و تہذیب سے وابستہ اس فکری رجحان کا باقاعدہ آغاز ہوا جسے بعد ازاں تحریک مشرق سے تعبیر کیا گیا۔

گوٹے (۱۷۴۹-۱۸۳۲):

یوہان وولف گینگ فان گوٹے (۱۷۴۹-۱۸۳۲) جرمنی کے عظیم ترین ادیب اور شاعر ہیں جن کا شمار عالمی ادب کی ان شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی فکری وسعتوں سے پوری ایک صدی کو متاثر کیا۔ گوٹے کی ابتدائی تعلیم اگرچہ قانون کی تھی مگر ان کا اصل رجحان ادب اور فلسفے کی جانب تھا۔ ۱۷۷۰ء میں اسٹراسبرگ یونیورسٹی کے دورے میں ان کی ملاقات یوہان گوٹ فرائیڈ ہرڈر سے ہوئی جس نے گوٹے کی فکری تشکیل میں

بنیادی کردار ادا کیا۔ ہر ڈر کے توسط سے گوٹے مشرقی ادب خاص طور پر فارسی اور عربی شاعری سے متعارف ہوئے۔ یہیں سے ان کے اندر مشرق کی طرف فکری میلان کی ابتدائی جھلک ملتی ہے۔

۱۷۷۵ء میں گوٹے ویمیر منتقل ہوئے جہاں انہوں نے ڈیوک کارل اگست کے مشیر کی حیثیت سے طویل عرصہ خدمات انجام دیں۔ ۱۷۹۳ء میں فریڈرک شلر سے دوستی نے ان کی فکری و ادبی زندگی کو نئی توانائی بخشی اور جرمن کلاسیکی ادب کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں نپولینی جنگوں کے باعث یورپ میں سیاسی بے چینی اور فکری انتشار پھیل گیا۔ گوٹے اس دور میں مغربی روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کے سوانح نگار کے الفاظ میں انیسویں صدی کے اوائل میں یورپ کی سیاسی صورت حال بالخصوص نپولینی جنگوں نے گوٹے کے ذہن و فکر پر گہرا اثر ڈالا۔ گوٹے مغرب کی روحانیت سے بیزار ہو چکا تھا۔ جس کا اظہار گوٹے کے مشہور سوانح نگار نے ان الفاظ میں کیا:

During the storms of war Goethe had more and more withdrawn, in spirit, from the European world and taken refuge in the original abode of man in Asia, in order in those far-off regions to restore that serene harmony of his being which had been disturbed by the discordant notes of the restless age. (10)

۱۸۰۸ء میں فاؤسٹ کی حصہ اول شائع ہوئی لیکن ان کی فکری زندگی کا ایک نہایت اہم مرحلہ ۱۸۱۳ء میں سامنے آیا جب وہ پینتھ برس کی عمر میں مشرقی ادب کی جانب سنجیدہ طور پر متوجہ ہوئے۔ اس رجحان کے پس منظر میں نپولینی جنگوں سے پیدا ہونے والی فکری مایوسی اور جوزف فان ہیمر پرگسٹال کے ذریعے حافظ شیرازی کے جرمن ترجمے (۱۸۱۲ء-۱۸۱۳ء) کا بنیادی کردار تھا۔ اسی فکری میلان کے نتیجے میں گوٹے نے ۱۸۱۴ء سے ۱۸۱۹ء کے درمیان West-östlicher Divan تخلیق کیا جو جرمن ادب میں مشرقی فکر اور شعری روایت کے اثرات کا ایک عظیم نمونہ ہے۔ ۱۸۳۱ء میں انہوں نے فاؤسٹ کا حصہ دوم مکمل کیا اور ۲۲ مارچ ۱۸۳۲ء کو ویمیر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ جرمن شاعر ہنریش ہائن نے ۱۸۳۶ء میں اپنی کتاب The Romantic School میں گوٹے کے دیوان مغربی کو مغرب کا مشرق کی طرف ایک سلام قرار دیا۔ ہائن لکھتا ہے:

The charm of this book is in describable it is a selam sent by the occident to the orient. .... The meaning of this selam is that the Occident, grown weary of its frigid, meagre

spiritualism, seeks again to refresh itself amid the wholesome physical pleasures of the Orient.( 11)

ہائے کے مطابق مغرب اپنی ٹھنڈی اور کمزور روحانیت سے تنگ آکر مشرق کی صحت مند جسمانی دنیا میں تازگی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تقریباً ایک صدی بعد علامہ اقبال نے اسی خیال کو اپنایا اور پیام مشرق لکھ کر اس سلام کا جواب دیا۔

گوئے کی حافظ سے دلچسپی:

خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی (۱۳۲۵-۱۳۹۰) چودہویں صدی کے ایران کے سب سے بڑے غزل گو شاعر ہیں۔ انہیں لسان الغیب (پوشیدہ کی زبان) اور ترجمان الاسرار (اسرار کی تشریح کرنے والے) جیسے القابات سے نوازا جاتا ہے۔ حافظ کی شاعرانہ حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کا مرتبہ فارسی ادب میں شیکسپیر اور گوئے جیسا ہے۔ حافظ نے بچپن میں ہی قرآن مکمل حفظ کر لیا تھا اسی وجہ سے انہیں حافظ کا خطاب ملا جو بعد میں ان کا تخلص بن گیا۔ حافظ کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دو سطحوں پر پڑھا جاسکتا ہے۔ ایک سطح پر یہ عشق و مستی کی دنیاوی شاعری ہے جو شراب، گل و بلبل، ساقی اور محبوب کی علامتوں سے بھرپور ہے۔ دوسری سطح پر یہ تصوف اور معرفت کی گہرائیوں میں لے جاتی ہے جہاں شراب فنا فی اللہ کی علامت ہے اور ساقی مرشد و راہنما کے استعارے ہیں۔ حافظ کی شاعری کو صوفیانہ تصوف اور عرفان کی بلند ترین مثالوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کی غزلیں محبت، ایمان اور ریاکاری کے انکشاف کے موضوعات پر مبنی ہیں۔ آپ عشق، شراب اور شراب خانوں کی گفتگو کرتے ہیں جو مذہبی بے خودی اور پابندیوں سے آزادی کی علامت ہیں۔

حافظ نے اس دور میں آنکھ کھولی جب شیراز پر قاتل حکمرانوں کے حملے ہو رہے تھے اور شہر امن و سکون سے محروم تھا۔ ان کی شاعری میں اسی دور کے سیاسی اٹھل پھٹل کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ وہ کبھی کسی بادشاہ کی چاپلوسی کرنے والے شاعر نہیں رہے بلکہ ہمیشہ اپنی آزادانہ آواز برقرار رکھی۔ ان کا دیوان جس میں قریب ۵۰۰ غزلیں شامل ہیں آج بھی ایرانی گھرانوں کی زینت ہے اور لوگ ان کے اشعار کو فال کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسی کیا خاص بات تھی کہ گوئے جیسا کثیر الحجمت عالم حافظ کی شخصیت و فن سے اتنا متاثر ہوا؟ گوئے نے جب فان ہیمر کا ترجمہ پڑھا تو یہ گوئے کے لیے ایک شدید جھٹکا تھا جیسے کوئی روشن مینار ان کے سامنے نمودار ہوا جو جس کا اظہار گوئے کے مشہور سوانح نگار نے ان الفاظ میں کیا ہے:

The bard of Shiraz seemed the very image of himself. Had he himself, perchance, lived once before upon the earth in the form of the Persian? Here was the same joy of earth and love of heaven, the same simplicity and depth. (12)

گوئے کو حافظ میں تین چیزیں سب سے زیادہ متاثر کرتی تھیں۔ اول حافظ کی خود شناسی اور آزادی کیونکہ حافظ نے اپنی شاعری میں کبھی کسی بادشاہ کی چابلو سی نہیں کی ہمیشہ اپنی آزادانہ آواز برقرار رکھی۔ گوئے نے انہیں مقدس حافظ (Holy Hafiz) اور آسمانی دوست (Celestial Friend) جیسے القابات دیے۔ دوم عشق کا فلسفہ، حافظ کی شاعری میں عشق صرف جسمانی نہیں بلکہ ایک روحانی اور معرفتی سفر ہے۔ سوم لذتِ زندگی اور شادمانی ہے۔ حافظ کی شاعری میں زندگی سے لطف اندوز ہونے کا پیغام ہے جیسے شراب نوشی، حسن پرستی اور شادمانی مگر یہ سب ایک اعلیٰ روحانی منزل کے سفر کی علامتیں ہیں۔

گوئے کے کلام میں حافظ کو خراجِ تحسین:

گوئے نے اپنے دیوانِ شرق و غرب کے دوسرے باب حافظ نامہ (Book of Hafis) میں حافظ کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ان کا پورا دیوان بارہ ابواب (معنی نامہ، حافظ نامہ، عشق نامہ، تفکیر نامہ، رنج نامہ، حکمت نامہ، تیمور نامہ، زلیخا نامہ، ساتی نامہ، مثل نامہ، پارس نامہ، خلد نامہ پر مشتمل ہے جس میں حافظ نامہ سب سے اہم ہے۔ گوئے اس باب کے ایک جزو جسے Unbegrenzt کا نام دیتے ہیں۔ جس کا اردو ترجمہ لا محدودیت ہے۔ حافظ کی شاعری کی لا محدودیت کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

Dass du nicht enden kannst, das macht dich gross, / Und dass du nie beginnst, das ist dein Los. / Dein Lied ist drehend wie das Sternengewölbe, / Anfang und Ende immer dasselbe. (13)

اردو ترجمہ: تیرا ختم نہ ہونا تجھے عظیم بناتا ہے اور تیرا کبھی آغاز نہ کرنا تیرا مقدر ہے۔ تیرا گیت ستاروں کے گنبد کی طرح گردش کرتا ہے۔ آغاز اور انجام ہمیشہ ایک جیسے ہیں۔

گوئے نے حافظ کی شاعری کی ازلیت اور لا محدودیت کو اس انداز میں پیش کیا ہے جیسے یہ شاعری خود کائنات کی طرح ابدی ہو۔ Offenbar Geheimnis (عمیاں راز) اسی باب کے ایک اور شعر میں گوئے حافظ کے تصوف کو جرمن قارئین کے لیے واضح کرتے ہیں:

Sie haben dich, heiliger Hafis, / Die mystische Zunge  
genannt / Und haben, die Wortgelehrten, / Den Wert des  
Worts nicht erkannt. (14)

اردو ترجمہ: اے مقدس حافظ انہوں نے تجھے صوفیانہ زبان کا نام دیا ہے اور لفظوں کے عالم نے لفظ کی

قدر نہیں پہچانی۔

گوئے نے اس شعر میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ حافظ کی شاعری کے اصل مفہوم تک پہنچنے کے  
لیے صرف لفظی ترجمہ کافی نہیں بلکہ صوفیانہ بصیرت درکار ہے۔

Nachbildung (نقلی) گوئے نے حافظ کی تقلید کے بارے میں ایک اور مقام پر کہا:

Zugemessne Rhythmen reizen freilich, / Das Talent erfreut  
sich wohl darin, / Doch wie schnelle widern sie  
abscheulich, / Hohle Masken ohne Blut und Sinn. (15)

اردو ترجمہ: "مقررہ بحر یقیناً دلکش ہوتی ہیں ذوق ان سے لطف اندوز ہوتا ہے لیکن کتنی جلدی وہ

گھنوں لگنے لگتی ہیں خالی نقاب، بغیر خون اور بغیر روح کے۔

گوئے نے قارئین کو خبردار بھی کیا ہے کہ محض حافظ کی بحروں اور توانی کی نقل کرنا کافی نہیں بلکہ

ضروری ہے کہ اس کی روح کو سمجھا جائے۔ شفیق شمیم کی کتاب Goethe and Hafiz: Poetry

and History in the West-östlicher Divan (۲۰۱۳) اس تعلق کی بہترین تحقیق پیش

کرتی ہے۔ شمیم کے مطابق گوئے کا مغربی دیوان جرمن شاعری میں ایک موڑ ہے۔ اس کتاب میں تین اہم نکات

سامنے آتے ہیں۔ پہلا روشن خیالی کا اثر ہے جس کے متعلق شمیم بتاتے ہیں کہ حافظ کا گوئے کے دیوان میں موجود

ہونا یورپی روشن خیالی (Enlightenment) کا نتیجہ ہے۔ جب یورپ میں جمالیات (aesthetics) کا

عروج ہوا اور تاریخ کو سیکولر انسانی تصور سے دیکھا جانے لگا تو غیر یورپی ادب کے استقبال کے لیے راہ ہموار

ہوئی۔ دوسرا ترجمے کا کردار ہے۔ شمیم اس بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ شاعری اور شاعری کی ترقی میں ترجمے نے

کیا کردار ادا کیا جیسا کہ سرولیم جوز (۱۷۴۶-۱۷۹۴) اور جوزف فان ہیمرپرگستال (۱۷۷۴-۱۸۵۶) کے کاموں

میں دیکھا جاسکتا ہے۔ تیسرا تاریخ کا تصور ہے۔ گوئے نے تاریخ کے لکیری تصور (linear notion of

history) کے برعکس ایک ایسا شاعری تصور پیش کیا جو ماضی اور حال کو ایک ساتھ لے کر چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ حافظ جو ۶۰۰ سال پہلے کا شاعر ہے گوئے کے دیوان میں ایک ہم عصر کی طرح موجود ہے۔

حافظ کی شاعری نے گوئٹے کو جو سب سے بڑی چیز دی وہ تھی تاریخ سے ماورا ایک شعری بصارت تھی۔ گوئٹے نے حافظ میں وہ کچھ پایا جو انہیں یونانی ادب میں نہیں ملا تھا ایک ایسی شاعری جو بیک وقت زمینی بھی آسمانی بھی، عشقیہ بھی اور صوفیانہ بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ گوئٹے نے حافظ کو "مقدس" کا درجہ دیا اور ان کے دیوان کو جرمنی میں "مشرقی تحریک" کی بنیاد بنایا وہی تحریک جسے بعد میں اقبال نے "تحریک مشرق" کا نام دیا۔ آرتھر ریگی اپنی کتاب میں اس تحریک کے متعلق لکھتے ہیں:

The Oriental movement which manifested itself so strikingly in German literature during the nineteenth century is familiar to every student of that literature. Although the general nature of this movement is pretty clearly understood, no systematic investigation of it, so far as I know, has ever been undertaken. (16)

آرتھر ریگی کے اس اعتراف کے باوجود کہ اس تحریک کی کوئی منظم تحقیق نہیں کی گئی اس تحریک کے مرکزی کرداروں کی نشاندہی کرنا ممکن ہے۔ گوئٹے کے بعد جس نے اس تحریک کو تقویت بخشی وہ فریدریش روکرٹ ہے جسے مشرقی تحریک کی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اگر گوئٹے نے حافظ کی شاعری کو جرمنی میں متعارف کرایا تو روکرٹ نے اسے جرمن زبان میں ڈھال کر ایک نئی تخلیقی جہت عطا کی۔

### مشرقی تحریک کی مرکزی شخصیت روکرٹ:

فریدریش روکرٹ ۱۶ مئی ۱۷۸۸ء کو جرمنی کے شہر شوانسفرٹ میں پیدا ہوئے۔ وہ جرمنی کے عظیم شاعر، زبانوں کے ماہر اور مترجم تھے۔ روکرٹ نے قانون کی تعلیم حاصل کی لیکن جلد ہی ان کا رخ ادب اور مشرقی زبانوں کی طرف مڑ گیا۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے چالیس سے زیادہ زبانیں سیکھی تھیں جن میں عربی، فارسی، سنسکرت، ترکی، عبرانی اور یونانی وغیرہ شامل تھیں۔ اپنی اس غیر معمولی لسانی مہارت کی وجہ سے وہ اپنے دور میں "زبانوں کا جیننٹس" کہلائے۔

روکرٹ نے اپنے ادبی سفر کا آغاز جرمنی کی نپولین کے خلاف جنگ آزادی کے دوران کیا۔ سن ۱۸۱۳ء میں انہوں نے "گے ہارنٹے زونینے" (زرہ پوش سونیٹ) کے عنوان سے سیاسی نظمیں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ اس کے بعد انہوں نے محبت کی نظموں کا مجموعہ "لیسفرلنگ" (محبت کی بہار) لکھا جو انیسویں صدی کی مقبول ترین جرمن شاعری میں شمار ہوتا ہے۔

سن ۱۸۱۸ء میں ویانا میں جوزف فان ہیمر پریگستال سے ملاقات نے روکرٹ کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ اس ملاقات کے بعد انہوں نے فارسی، عربی اور سنسکرت سیکھنے کا عزم کیا۔ ریچی کے مطابق اگر گوٹے نے جرمنی میں مشرقی تحریک کی بنیاد رکھی تو روکرٹ نے اسے عروج تک پہنچایا۔ روکرٹ کا شمار انیسویں صدی کے جرمنی کے ان چند شاعروں میں ہوتا ہے جنہوں نے مشرقی ادب کو محض ترجمہ کر کے پیش نہیں کیا بلکہ اسے اپنی شاعری میں نئے رنگوں میں ڈھال کر جرمن ادب کا حصہ بنا دیا۔ ۱۸۲۶ء میں روکرٹ ایرلنگن یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کے پروفیسر مقرر ہوئے اور ۱۸۴۱ء میں وہ برلن یونیورسٹی چلے گئے جہاں انہوں نے ۱۸۴۹ء تک تدریس جاری رکھی۔

روکرٹ نے بھی حافظ کے دیوان کے مخصوص حصوں کا ترجمہ کیا مگر روکرٹ اور فان ہیمر کے تراجم میں ایک بنیادی فرق ہے۔ فان ہیمر نے حافظ کے فارسی کلام کو جرمن زبان میں منتقل کیا جبکہ روکرٹ نے حافظ کے طرز سخن کو سمجھ کر اس کے انداز میں نئی جرمن شاعری تخلیق کی۔ فان ہیمر کا ترجمہ ایک پیشہ ور مستشرق کا کام تھا۔ ان کا مقصد فارسی متن کو جرمن قارئین تک پہنچانا تھا۔ انہوں نے حافظ کے دیوان کا پہلا مکمل ترجمہ کیا جو علمی حلقوں میں آج بھی ایک اہم کام سمجھا جاتا ہے۔ فان ہیمر نے عموماً "آنگی ریڈ ڈسٹیکن" (بغیر قافیے کے دو مصرعی اشعار) یا چار مصرعی اشعار کا انتخاب کیا۔ دوسری طرف روکرٹ کا انداز بالکل مختلف تھا۔ روکرٹ نے "ناختہ یختونگ" (تخلیقی شاعرانہ ترجمہ) کا اسلوب اپنایا یعنی مشرقی شاعری کے انداز میں نئی تخلیق کرنا محض ترجمہ نہیں کرنا۔ وہ فارسی اصلیت کی شکلی ہیئت (Form) کو جرمن میں ڈھالنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس نے دو مصرعی اشعار کے بند تخلیق کیے جن میں دوسری سطر میں ایک جیسے قافیے ہوتے تھے۔ روکرٹ کے بارے میں پال ہورن نے اپنے مضمون میں لکھا:

Wie Rückert zuerst die bald so beliebte Form der  
„Vierzeiler“ in die deutsche Poesie eingeführt hat,/- so hat  
er auch (17)

ترجمہ: "جس طرح روکرٹ نے سب سے پہلے چار مصرعی (رباعی) کی اس شکل کو، جو بعد میں اتنی مقبول ہوئی، جرمن شاعری میں متعارف کروایا۔

روکرٹ کا پہلا بڑا مشرقی مجموعہ اوستیلشے روزن" (مشرقی گلاب) تھا جو سن ۱۸۲۲ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ حافظ کے انداز میں لکھا گیا تھا۔ اپنے دیباچے میں روکرٹ نے گوٹے کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:

Wollt ihr kosten Reinen Osten, müsst ihr gehn von hier  
zum selben Manne, der vom Westen auch den besten Wein  
von jeher schenkt' aus voller Kanne. (18)

ترجمہ: اگر تم خالص مشرق کا مزہ چکھنا چاہتے ہو تو تمہیں اسی شخص کے پاس جانا ہوگا جس نے مغرب سے بہترین شراب بھری ہوئی کمانڈ سے پیش کی۔

اس مجموعے میں روکرٹ نے حافظ کی شاعری کے فلسفے عشق، شراب، شادمانی اور خود شناسی کو جرمن قارئین کے سامنے پیش کیا۔ ایک اور شعر میں انہوں نے حافظ کو خراج تحسین پیش کیا:

"Die Gasselle sollte springen,  
Nachtigall den Gruß erwidern,  
Wenn ich trunken wollte singen  
Stellen aus Hafisens Liedern (19)

ترجمہ: "غزال کو اچھلنا چاہیے، بلبل کو جواب دینا چاہیے، جب میں مست ہو کر حافظ کے گیتوں کے اشعار گانا چاہوں۔"

روکرٹ نے عربی کے مشہور ادیب حریری کے "مقامات" کا ترجمہ بھی کیا جسے انہوں نے "دی فیروانڈ لنگن دس ابوسید" (ابوسید کی تبدیلیاں) کا نام دیا۔ یہ ترجمہ اپنی منفرد زبان اور فن کی وجہ سے بے مثال سمجھا جاتا ہے۔ ایک ادیب نے اس کے بارے میں کہا کہ اس میں روکرٹ نے جرمن زبان کو ایسے کرتب دکھانے کی صلاحیت عطا کر دی جیسے کوئی ایکروبیٹ اپنے فن کے تمام تر کرتب دکھاتا ہے۔

ہندوستانی فلسفے پر روکرٹ کی سب سے بڑی تصنیف "دی وائز ہائٹ دس برہمن" (برہمن کی حکمت) ہے جو چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ سن ۱۸۳۶ء سے ۱۸۳۹ء کے درمیان شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے ہندوستانی فلسفے، اخلاقیات اور حکمت کو جرمن قارئین کے لیے پیش کیا۔ جدید محققین کے مطابق روکرٹ نے اس مجموعے میں خود کو ایک "مغربی برہمن" کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ روکرٹ نے "برہمنیہ ارزیلوگن" (برہمنی کہانیاں) سن ۱۸۳۹ء میں شائع کیں جس میں انہوں نے ہندوستانی ادب کے تراجم پیش کیے۔

سن ۱۸۳۷ء میں "مورگنلینڈ شے زاگن اوند گشیشٹن" (مشرقی داستانیں) شائع کی جو فارسی تاریخ اور داستانوں پر مشتمل تھی۔ انہوں نے فردوسی کی شاہنامہ سے "روستیم اوند سہراب" کا بھی ترجمہ کیا۔

### روکرٹ کی شعری خصوصیات

روکرٹ نے سب سے پہلے غزل کی شکل کو جرمنی میں متعارف کرایا۔ ان کی ایک غزل میں ایک ہی قافیے کی چھبیس مختلف صورتیں پائی جاتی ہیں لیکن یہ اتنی نرمی اور خوبی سے پیش کی گئی ہیں کہ قاری کو ان کی بناوٹ کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ دریں اثنا کاؤنٹ پلائن نے بھی راکرٹ سے ایک سال پہلے غزلیں لکھی تھیں لیکن راکرٹ کی غزلیں ان سے کہیں زیادہ بھرپور اور ماہرانہ ہیں۔

### قافیے کی ندرت

روکرٹ کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی قافیوں کی ندرت اور جدت ہے۔ وہ ایسے مشکل قافیے استعمال کرتے تھے جن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ان کے عربی تراجم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے جرمن زبان میں قافیے کے ایسے کرشمے دکھائے جیسے کوئی اکیرو بیٹ اپنے فن میں مہارت حاصل کر لے۔

### مشرقی انداز کی پاسداری

روکرٹ کے تراجم میں مشرقی اصلیت کی روح اور لفظی خوبیاں اس طرح جھلکتی ہیں کہ قاری کو لگتا ہے وہ اصل فارسی یا عربی شاعری پڑھ رہا ہے۔ وہ صرف لفظوں کو نہیں بلکہ مشرق کی "روح" کو جرمن زبان میں منتقل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

### آرٹ فارم کی اہمیت

روکرٹ کا خیال تھا کہ مشرقی ادب کو جرمن قارئین تک پہنچانے کے لیے فارم (شکلی ہیئت) سب سے اہم ہے۔ انہوں نے اپنے ناشر کو لکھا کہ ان کی مشرقی نظمیں "اوستلیشے روزن" گوئے کی نظموں سے اس لحاظ سے مختلف ہوں گی کہ گوئے نے روح پر توجہ دی جبکہ وہ شکل پر توجہ دیں گے۔

## تخلیقی ترجمہ اور آزادی

روکرٹ کا ماننا تھا کہ ترجمہ صرف لفظوں کی تبدیلی کا نام نہیں بلکہ ایک تخلیقی عمل ہے۔ اس نے خود فرمایا تھا: "شاعری کرنا اور فنی اشعار کہنا میرے لیے ایک ضرورت ہے، اگر میرا اپنا گیت نہ ہو تو میں اپنے لیے ایک ترجمہ کر لیتا ہوں"۔

## ناقدین کی آراء اور جدید تحقیق

روکرٹ کی شاعری کے بارے میں یہ بات عام ہے کہ وہ زبانوں پر غیر معمولی مہارت اور تخلیقات کی وجہ سے اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ تنہا سمجھے جاتے تھے۔ اس کے حقیقی ہم عصر سعدی اور حریزی تھے نہ کہ جرمن شاعر۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ ان کا تعلق دراصل جرمنی سے نہیں بلکہ فرات کے کناروں سے تھا۔ راکرٹ نے اپنی ترجمہ نگاری کے ذریعے جرمن زبان کو ایک عالمی زبان میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جو روحانی مصالحت کا ذریعہ بن سکے۔ راکرٹ کی شاعری کے بارے میں ایک اور رائے یہ ہے کہ وہ جرمنی کا سب سے زیادہ اثر انگیز، ہمہ گیر اور اصلی شاعر ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ زبان پر ان کی غیر معمولی گرفت کبھی کبھی ان کی شاعری کو مصطنع اور بچکانہ بنا دیتی ہے۔ ان تمام خوبیوں اور خصوصیات کی وجہ سے ریگی انہیں "مشرقی تحریک کی مرکزی شخصیت" قرار دیتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے علم اور فن کا حسین امتزاج پیش کیا۔ وہ ایک طرف حافظ کے انداز میں غزلیں لکھتے تھے تو دوسری طرف ہندوستانی اپنشدوں کا ترجمہ کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں فارسی اور ہندوستانی دونوں روایات کی جھلک ملتی ہے۔

## فان پلاٹن (۱۷۹۶-۱۸۳۵)

آگسٹ فان پلاٹن ۲۴ اکتوبر ۱۷۹۶ء کو جرمن شہر انسباخ میں ایک اعلیٰ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے میونخ میں کیڈٹ اسکول میں تعلیم حاصل کی اور ۱۸۱۴ء میں باویرین فوج میں لیفٹیننٹ مقرر ہوئے۔ ۱۸۱۵ء میں نیپولین کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ ۱۸۱۸ء میں انہوں نے ویزبرگ یونیورسٹی میں فلسفہ اور فلولوجی کی تعلیم شروع کی اور اگلے سال ایرلنگن یونیورسٹی چلے گئے جہاں وہ مشہور فلسفی شیلنگ کے شاگرد بنے۔ پلاٹن نے ایرلنگن یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ وہ فارسی شاعری خاص طور پر حافظ کے کلام سے بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے جرمنی میں مشرقی شاعری کے اس رواج کو اپنا باجوہ گونے اور راکرٹ نے شروع کیا تھا۔ آپ اپنے نظموں کے مجموعے Gedichte میں حافظ کے بارے میں لکھتے ہیں:

Das mochte Hafis wohl im Geist bedenken,  
 Und ließ getrost des Lebens Stürme rollen:  
 Wenn in Befriedigung wir uns versenken,  
 Entgehn wir eigner Qual und fremdem Grollen:  
 Beym Wein im Becher, bey dem Kuß des Schenken,  
 Bey Liedern, die melodisch ihm entquollen,  
 Empfand er stets im Herzen sich gesünder,  
 Wiewohl sie schrien: Es ist ein großer Sünder (20)!

ترجمہ:

شاید حافظ نے یہ بات دل میں سوچ لی تھی  
 اور زندگی کے طوفانوں کو اطمینان سے گزرنے دیا  
 جب ہم خود کو تسکین میں ڈبو دیتے ہیں  
 تو ہم اپنی اذیت اور دوسروں کی ملامت سے بچ جاتے ہیں  
 جام میں شراب کے ساتھ، ساقی کے بوسے میں  
 اور ان نغموں میں جو اس کے دل سے بہہ نکلتے تھے  
 وہ ہمیشہ اپنے دل میں خود کو زیادہ تندرست محسوس کرتا  
 اگرچہ لوگ پکاراٹھتے: "یہ تو بہت بڑا گناہگار ہے"

پلاٹن کی اہم تخلیقات میں "غزلیں" (۱۸۲۱ء)، "یریشے بلٹر" (۱۸۲۱ء)، "شمپنگل دس حافظ" (۱۸۲۲ء)، "فیریشے شریفتن" (۱۸۲۲ء) اور "نئے غزلیں" (۱۸۲۳ء) شامل ہیں۔ پلاٹن نے روکرٹ کے طرز کی پیروی کرتے ہوئے اپنی غزلیں لکھیں لیکن ان کی غزلوں کی اپنی ایک جداگانہ شناخت تھی۔ گونسے نے مشرقی شاعری کے موضوعات کو جرمنی میں متعارف کرایا اور روکرٹ نے حافظ کے اشعار کو جرمن میں ڈھالا

لیکن پلاٹن نے غزل کی مشکل ترین ہیئت کو جرمن زبان میں شامل کرنے کی جرات کی۔ ان کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی اس کی ہیئت اور بیان کی پاکیزگی اور خوبصورتی تھی۔ ان کی غزلوں نے گوئے کی توجہ بھی حاصل کی۔ پلاٹن نے فارسی غزل کی ایک خاص خوبی کو جرمنی میں متعارف کرایا۔ غزل کی شکل میں پورا شاعر ایک ہی قافیے پر ختم ہوتا ہے اور قافیے کے بعد آنے والے الفاظ (جو ردیف کہلاتے ہیں) بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ جرمن زبان میں یہ ہیئت بہت مشکل تھی لیکن پلاٹن نے اسے کامیابی سے ڈھال لیا۔ ان کی پہلی غزلوں میں مشرق اور مغرب کو الگ الگ دکھایا گیا تھا لیکن بعد کی تخلیقات میں انہوں نے اپنی شناخت کو مشرقی شناخت میں ضم کر لیا۔ پلاٹن کی غزلیں محض مشرقی تقلید نہیں تھیں بلکہ ان میں ان کی اپنی ذاتی کیفیات اور جذبات جھلکتے تھے۔

۱۸۲۶ء میں پلاٹن اٹلی چلے گئے اور باقی زندگی فلورنس، روم اور نپلز میں گزاری۔ ان کی مشہور نظم "تریستان" ۱۸۲۵ء میں شائع ہوئی۔ آگسٹ فان پلاٹن ۵ دسمبر ۱۸۳۵ء کو سیراکیوز (اٹلی) میں انتقال کر گئے۔ ریگی کے مطابق پلاٹن نے مشرقی شاعری کی مشکل ہیئت کو جرمن زبان میں ڈھالنے میں اہم کردار ادا کیا لیکن ان کی اہمیت رو کرٹ سے کم ہے۔ مگر پلاٹن کی غزلیں آج بھی جرمنی میں مشرقی شاعری کی بہترین مثالوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

#### فریدریش بوڈن سٹاٹ (۱۸۱۹-۱۸۹۲)

فریدریش مارٹن فان بوڈن سٹاٹ ۲۲ اپریل ۱۸۱۹ء کو جرمن شہر پائے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی جوانی میں گونٹن، میونخ اور برلن کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کے بعد وہ روس چلے گئے جہاں انہوں نے ایک خاندان میں استاد کی حیثیت سے کام کیا۔ یہاں انہوں نے روسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا اور پشکن، لیر مونتوف اور ترگنیف جیسے روسی ادیبوں کے تراجم کیے جو روسی اصل کے برابر سمجھے جاتے تھے۔

بوڈن سٹاٹ کی قسمت کاسب سے بڑا سنگ میل ان کا جارجیا کے شہر تفلیس جانا تھا۔ وہاں وہ ایک اسکول کے سربراہ مقرر ہوئے۔ تفلیس میں قیام کے دوران انہوں نے فارسی ادب کا مطالعہ شروع کیا اور یہاں ان کی ملاقات ایک آذربائیجانی شاعر میرزا شانی وازہ سے ہوئی۔ میرزا شانی وازہ ایک فارسی اور آذربائیجانی زبان کے شاعر تھے جنہوں نے بوڈن سٹاٹ کو فارسی ادب سکھایا۔ تفلیس میں قیام کے دوران ہی بوڈن سٹاٹ نے اپنے استاد میرزا شانی کی شاعری کو جمع کیا اور اس کا جرمن میں ترجمہ کیا۔ ۱۸۵۱ء میں ان کاسب سے مشہور مجموعہ "دی لایڈر دس میرزا شانی" (میرزا شانی کے گیت) شائع ہوا۔ اس مجموعے نے جرمنی میں ایسی مقبولیت حاصل کی جس کا موازنہ

صرف ایڈورڈ فزجرالد کی "رباعیات عمر خیام" کی مقبولیت سے کیا جاسکتا ہے۔ یہ مجموعہ جرمنی میں ۱۶۰ ایڈیشن تک پہنچ گیا اور تقریباً تمام یورپی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔

بوڈن سٹاٹ کے اس مجموعے کے بارے میں ایک دلچسپ تنازع بھی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بوڈن سٹاٹ نے یہ نظمیں خود لکھیں اور انہیں مشرقی لباس میں پیش کر کے مقبولیت حاصل کی۔ اور کچھ کا کہنا ہے کہ یہ اصل میں میرزا شانی کی شاعری کا ترجمہ تھا۔ بعد ازاں بوڈن سٹاٹ نے خود اعتراف کیا کہ انہوں نے میرزا شانی کی شاعری میں اپنی طرف سے بہت کچھ اضافہ کر دیا تھا۔ ڈچ جریدے "ڈی گائیڈز" کے ایک مضمون میں کہا گیا تھا کہ "ایک فارسی شاعر جو بالکل نئے جرمنی کی روح سے ہم آہنگ ہو یقیناً ایک عجیب مظہر ہے"۔ اسی مضمون میں یہ بھی لکھا گیا کہ بوڈن سٹاٹ نے اپنے آپ کو اتنی خوبی سے اس مشرقی کردار میں ڈھال لیا تھا کہ ان کی تخلیقات کی مشرقی اصلیت پر شک کرنا مشکل تھا۔ اس کی ایک مثال زیرِ سطور ہے:

Was giebt es Höheres in der Welt, als die Frauen? ... Und wahrlich, ich sage Dir: die Frauen sind das Wesen Allah's auf Erden! Sie sind die Trägerinnen des Lebens, die Säulen der Anmuth, die Edelsteine in der Krone des Glücks. Wer es mit ihnen hält, der ist wohlberathen. Ein Kuß auf die Hand einer Schönen ist besseres Labsal als der Genuß der köstlichsten Speisen. (21)

ترجمہ: دنیا میں عورتوں سے بڑھ کر کیا چیز ہے؟... اور میں تم سے سچ کہتا ہوں: عورتیں زمین پر اللہ کا جوہر ہیں! وہ زندگی کی حامل ہیں، خوبصورتی کے ستون ہیں، خوشی کے تاج میں جواہرات ہیں۔ جو ان کا ساتھ دیتا ہے وہ بخوبی نصیحت یافتہ ہے۔ کسی خوبصورت کے ہاتھ پر ایک بوسہ، لذیذ ترین کھانوں کے استعمال سے بہتر تسکین ہے۔

۱۸۵۲ء میں بوڈن سٹاٹ میونخ یونیورسٹی میں سلاوی زبانوں کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۸ء میں انہوں نے یہ عہدہ چھوڑ کر ابتدائی انگریزی ادب کی پروفیسری قبول کر لی اور شیکسپیر کی طرف توجہ دی۔ انہوں نے دوسروں کے ساتھ مل کر شیکسپیر کے کاموں کا ترجمہ کیا اور خود شیکسپیر کے سونٹوں کا ترجمہ کیا۔ ۱۸۶۶ء میں انہیں ماننگٹن کے کورٹ تھیٹر کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ بوڈن سٹاٹ کی دیگر اہم تخلیقات میں "تاؤزند اوئند آئن ٹاگ ایم اورینٹ" (۱۸۵۰ء) شامل ہے جو ان کے مشرقی سفر ناموں پر مشتمل ہے۔ انہوں نے عمر خیام کے

رباعیات کا بھی ترجمہ کیا جو ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا۔ ۱۸۹۰ء میں انہوں نے اپنی سوانح عمری "ایریزنگن آس ماینام لیبن" شائع کی۔

بوڈن سٹاٹ کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی اس کی "باکیٹھے ہیٹھ کائٹ" (مستی بھری خوش مزاجی) اور غیر متزلزل ہم واری تھی۔ ان کی شاعری میں مشرقی لباس کی پوری طرح پابندی کی گئی تھی اور اس میں تصوف کی پیچیدگیوں کی بجائے شراب، عشق اور زندگی کی خوشیوں کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے ہم عصر نقادوں کا کہنا تھا کہ بوڈن سٹاٹ نے اس مشرقی تحریک میں ایک ایسا رنگ بھرا جو عام قارئین تک پہنچنے والا تھا جبکہ روکرٹ اور پلاٹن کی شاعری زیادہ علمی اور پیچیدہ تھی۔ فریدریش بوڈن سٹاٹ ۱۸ اپریل ۱۸۹۲ء کو ویز باڈن میں انتقال کر گئے۔ ان کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ "میرزاشانی کے گیت" ہیں جو روکرٹ اور پلاٹن کی علمی شاعری کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہوئے اور انیسویں صدی کے جرمنی میں مشرقی شاعری کو عام قارئین تک پہنچانے میں موثر ثابت ہوئے۔

اس تحریک کا دائرہ ان پانچ بڑے ناموں تک محدود نہیں تھا۔ بہت سے دوسرے جرمن شعر اور ادیب بھی تھے جو مشرقی ادب سے متاثر ہوئے اور اس تحریک کا حصہ بنے۔ ان میں Adolf Friedrich von Schack خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنہوں نے فردوسی کے شاہنامہ کا جرمن میں ترجمہ کیا اور Stimmen vom Ganges جیسی اہم تصانیف پیش کیں۔ اسی طرح کے دیگر ناموں میں ڈومر (Dohm)، لوشکے (Loschke)، سٹانگ (Steig)، لٹز (Litz)، لینڈ (Lind)، ہولڈ (Hold) اور فان شاک (von Schack) شامل ہیں۔ ان میں سے بعض نے تراجم کیے، بعض نے مشرقی انداز میں اصل شاعری لکھی، اور بعض نے دونوں کام کیے۔ یہ سب مل کر اس مشرقی تحریک کا حصہ تھے جس کا ذکر اقبال نے اپنے دیباچے میں کیا۔ مشرقی تحریک محض چند تراجم کا نام نہیں تھی بلکہ یہ ایک تہذیبی اور روحانی مکالمہ تھا جو دو صدیوں پر محیط تھا۔ اولیہ لیس کے پہلے ترجمے سے لے کر بوڈن سٹاٹ کے عوامی انداز تک، جرمنی نے فارسی ادب کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اسے اپنی ثقافت کا حصہ بنا لیا۔ اس تحریک کی کامیابی کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ فارسی کے الفاظ جرمنی کی روزمرہ زبان میں شامل ہو گئے تھے چینیلی، شطرنج، چائے، بازار، جنت جیسے الفاظ اس بات کے شاہد ہیں کہ مشرق کی روح جرمن معاشرے میں رچ بس گئی تھی۔ گوٹے نے حافظ کو اپنا ہم مرتبہ مانا، روکرٹ نے مشرق کو جرمنی تک پہنچایا، پلاٹن نے فارسی غزل کو جرمن لہجہ دیا اور بوڈن سٹاٹ نے اس فلسفے کو عام آدمی کی زبان دی۔ اس تحریک سے وابستہ شعرا کے علاوہ ایسے نام (ہرڈر، شلر) بھی ہیں جو اس تحریک کا حصہ تو نہیں ہیں مگر

ان کے ہاں مشرقی اثرات بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں اور تحریک مشرق کے تاریخی پس منظر کو تحریر کرتے ہوئے انھیں کسی طور نظر انداز نہیں کیا جس سکتا ہے۔ یہ سلسلہ محض ادبی نہیں تھا بلکہ انسانی اقدار (عشق، آزادی، شادمانی) کی تلاش تھی جو مذہبی سختیوں اور روایتی پابندیوں سے ماورا تھی۔

ان تمام حقائق تک ہماری رسائی کا آغاز اس وقت ہوا جب علامہ اقبال نے اپنے فارسی مجموعہ پیام مشرق کے دیباچے میں اس تحریک کا ذکر کرتے ہوئے اسے "مشرقی تحریک" کا نام دیا۔ اقبال کے اسی دیباچے نے ہماری توجہ جرمنی میں جاری اس اہم ادبی و فکری رجحان کی طرف مبذول کرائی اور یہ حقیقت آشکار کی کہ وہاں کے شعر اور مفکرین نہ صرف مشرقی ادب، بالخصوص فارسی شاعری، سے گہری دل چسپی رکھتے تھے بلکہ اپنی تخلیقات میں اس کے اثرات کا واضح اظہار بھی کر رہے تھے۔ یوں اقبال کا یہ دیباچہ ہمارے لیے ایک ایسے درتچے کی حیثیت رکھتا ہے جس سے جرمنی میں پروان چڑھنے والی اس عظیم ادبی تحریک کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں۔ اقبال نے چند صفحات میں ایک ایسی داستان سمودی تھی جس کے پس منظر میں دو صدیوں پر محیط ادبی، فکری اور تہذیبی روابط کی ایک بھرپور تاریخ موجود تھی، اور اسی تاریخ کو اس مقالے میں قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اقبال نے پیام مشرق میں اسی تحریک کا ذکر کیا تھا یہ ایک ایسی تحریک جس نے مشرق اور مغرب کے درمیان ایک پل تعمیر کیا اور ثابت کیا کہ حقیقی شاعری اور حکمت کی کوئی قومی یا لسانی حد نہیں ہوتی۔ یہ مشرقی تحریک آج بھی اس بات کی یاد دہانی ہے کہ جب دو عظیم تہذیبیں آپس میں ملتی ہیں تو نہ صرف ادب بلکہ انسانی سوچ کے نئے افق کھلتے ہیں۔

## حوالہ جات

۱. محمد اقبال، پیام مشرق (لاہور: شیخ مبارک علی، ۱۹۲۳)، ص ۱۳۔

2. Arthur F. J. Remy, *The Influence of India and Persia on the Poetry of Germany* (New York: The Columbia University Press, 1901), p. 23..
3. Arthur F. J. Remy, *The Influence of India and Persia on the Poetry of Germany* (New York: The Columbia University Press, 1901), p. 08.
4. Arthur F. J. Remy, *The Influence of India and Persia on the Poetry of Germany* (New York: The Columbia University Press, 1901), p.14-15..
5. Suzanne L. Marchand, *German Orientalism in the Age of Empire: Religion, Race, and Scholarship* (Washington, D.C.: German Historical Institute; Cambridge and New York: Cambridge University Press, 2009), p.164.
6. Paul Horn. "Was verdanken wir Persien?" *Nord und Süd: Eine deutsche Monatsschrift*, Vol. 94, No. 282, September 1900, p.394.
7. Suzanne L. Marchand, *German Orientalism in the Age of Empire: Religion, Race, and Scholarship* (Washington, D.C.: German Historical Institute; Cambridge and New York: Cambridge University Press, 2009), p. 01.
8. Suzanne L. Marchand, *German Orientalism in the Age of Empire: Religion, Race, and Scholarship* (Washington, D.C.:

- German Historical Institute; Cambridge and New York: Cambridge University Press, 2009), p.149
9. Joseph Freiherr von Hammer-Purgstall, *Erinnerungen aus meinem Leben. 1774–1852*, hrsg. Reinhart Bachofen von Echt (Wien und Leipzig: Hölder-Pichler-Tempsky, 1940, p.37
  10. Bielschowsky, Albert. *The Life of Goethe*. 3 vols. Translated by William A. Cooper. New York: G.P. Putnam's Sons, 1905-1908, p.01
  11. Heinrich Heine, *The Romantic School*, trans. S. L. Fleishman (New York: H. Holt & Co., 1882), 71
  12. Bielschowsky, Albert. *The Life of Goethe*. 3 vols. Translated by William A. Cooper. New York: G.P. Putnam's Sons, 1905-1908, p.03.
  13. Johann Wolfgang von Goethe, *West-östlicher Divan* (Stuttgart: Cotta), 1819 p 42.
  14. Johann Wolfgang von Goethe, *West-östlicher Divan* (Stuttgart: Cotta), 1819 p 45.
  15. Johann Wolfgang von Goethe, *West-östlicher Divan* (Stuttgart: Cotta), 1819 p 44.
  16. Arthur F. J. Remy, *The Influence of India and Persia on the Poetry of Germany* (New York: The Columbia University Press, 1901), p 1.
  17. Paul Horn. "Was verdanken wir Persien?" *Nord und Süd: Eine deutsche Monatsschrift*, Vol. 94, No. 282, September 1900, pp. 386.

18. Friedrich Rückert. Östliche Rosen (Oestliche Rosen). Leipzig: F. A. Brockhaus, 1822 p 1.
19. Friedrich Rückert. Östliche Rosen (Oestliche Rosen). Leipzig: F. A. Brockhaus, 1822 p 448.
20. August von Platen, Gedichte (Stuttgart and Tübingen: Cotta, 1828), p 60.
21. Friedrich von Bodenstedt, Die Lieder des Mirza Schaffy (Berlin: Decker, 1851), p 1.

### کتابیات

● اقبال، محمد۔ پیام مشرق۔ لاہور: شیخ مبارک علی، ۱۹۲۳ء۔

- Bielschowsky, Albert. The Life of Goethe. 3 vols. Translated by William A. Cooper. New York: G. P. Putnam's Sons, 1905–1908.
- Bodenstedt, Friedrich von. Die Lieder des Mirza Schaffy. Berlin: Decker, 1851.
- Goethe, Johann Wolfgang von. West-östlicher Divan. Stuttgart: Cotta, 1819.
- Hammer-Purgstall, Joseph Freiherr von. Erinnerungen aus meinem Leben, 1774–1852. Edited by Reinhart Bachofen von Echt. Wien and Leipzig: Hölder-Pichler-Tempsky, 1940.
- Heine, Heinrich. The Romantic School. Translated by S. L. Fleishman. New York: H. Holt & Co., 1882.
- Horn, Paul. “Was verdanken wir Persien?” Nord und Süd: Eine deutsche Monatsschrift 94, no. 282 (September 1900): 386–394.

- Iqbal, Muhammad. Payam-e-Mashriq. Lahore: Sheikh Mubarak Ali, 1923.
- Marchand, Suzanne L. German Orientalism in the Age of Empire: Religion, Race, and Scholarship. Washington, D.C.: German Historical Institute; Cambridge and New York: Cambridge University Press, 2009.
- Platen, August von. Gedichte. Stuttgart and Tübingen: Cotta, 1828.
- Remy, Arthur F. J. The Influence of India and Persia on the Poetry of Germany. New York: Columbia University Press, 1901.
- Rückert, Friedrich. Östliche Rosen (Oestliche Rosen). Leipzig: F. A. Brockhaus, 1822.